Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

# ناول "آخر شب کے ہم سفر" میں طنزیہ و مزاحیہ عناصر

# Elements of Humor and Satire in the Novel "Akhir e Shab ke Hamsfar"

***غفور احمد**

* پی ایچ۔ڈی اُردو (سکالر)، ادارہ زبان و ادبیاتِ اُردو، یونیورسٹی آف پنجاب، لاہور۔

***Abstract***

*Qurratulain Hyder was an influential Urdu novelist. She is surely a master storyteller with great insight and ability to portray everything vividly and pictorially. The novel "Akhir e Shab ke Hamsafar" is a good resource of the neutral history of the subcontinent, the supremacy of time and the defeat of human dreams. The style of the novel change gradually and her humoristic approach turned into irony and bitterness.*

***Keywords:*** *Qurratulain Hyder, Akhir e Shab ke Hamsfar, Humor and Stire, Ideologies*

**کلیدی الفاظ:** قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، طنز و مزاح، نظریات

قرۃ العین حیدر کا ناول "آخر شب کے ہم سفر" ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ "آگ کا دریا" کی نسبت یہ بہت ہی محدود کینوس کا ناول ہے۔ مصنفہ کا کمال یہ ہے کہ اس نے اس محدود کینوس کو ہندوستان کی تقسیم، آزادی اور اشتراکی تحریک سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ کہیں بھی اس کی محدودیت کا احساس نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر محمد عارف کے خیال میں زمان و مکان کے حوالے سے اس کا کینوس نہایت وسیع ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مصنفہ نے وقت کے عہد بہ عہد ٹکڑے کرنے کی بجائے اسے واحد اور وقیع قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔(۱) ڈاکٹر صاحب کی رائے جزوی طور پر درست ہے لیکن " آگ کا دریا" اور "کارِ جہاں دراز ہے" کا قاری اس اختصار کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ ناول کا موضوع اور اس کا ماجرا اس امر کا متقاضی تھا کہ اسے ممکن حد تک مختصر رکھا جاتا، مصنفہ اس کوشش میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ناول کا زیادہ تر حصہ انیسویں صدی کے نصف اول پر پھیلا ہوا ہے۔ ان کم و بیش پچاس سالوں میں دنیا بھر میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انقلاب روس، جنگ عظیم اول، دوم اور ہندوستان کی آزادی چند بڑے بڑے واقعات ہیں۔ ایرانی مزدکیت سے ہوتا ہوا اشتراکیت کا سفر، کارل مارکس کے نظریات کی ہم راہی میں زار روس کا تختہ الٹ کر، تمام ہو گیا۔ اس تبدیلی کو جہاں دنیا بھر میں محسوس کیا گیا وہاں اس انقلاب نے ساری دنیا کے کمزور اور استحصال زدہ طبقوں کے لیے اُمید کی کرن بھی پیدا کر دی۔ مزدور اور کسان کا دکھ ایک علامت کی شکل اختیار کر گیا۔ شاعری کی پرانی تراکیب نئے معانی و مفاہیم سے آشنا ہوئیں۔ جنگ عظیم اول کے نتیجے میں خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کیے گئے تو ہندوستانی مسلمانوں نے اس ظلم کے خلاف موثر آواز اٹھائی۔ جنگ عظیم دوم نے برطانیہ کو تمام تر فتح کے باوجود اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ ایسی سلطنت جس میں کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا سکڑنا شروع ہو گئی اور یکے بعد دیگرے نو آبادیاتی خطے آزادی حاصل کرنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد ملنے والا اقتدار ابھی سو سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ پوری بساط ہی لپیٹ دی گئی۔ الغرض ان پانچ عشروں میں ہندوستان صدیوں کا سفر طے کر گیا۔ زیرِ مطالعہ ناول بھی انھی پانچ عشروں کی ایسی داستان ہے جو ایک نظریے کے متعارف ہونے، اس کے پنپنے اور اس کے زوال کا نوحہ پیش کرتا ہے۔ "قرۃ العین نے اس ناول میں تحریک آزادی کو اشتمالی لباس میں ملبوس دکھایا ہے۔"(۲) یہ اشتمالی لباس بہت جلد تار تار ہونا شروع ہو جاتا ہے جب وہی کردار اس نظریے کو نہ صرف فراموش کر دیتے ہیں بلکہ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے الفاظ میں جو مادیت کے غلبے کے زیر اثر اپنے آدرشوں کو فروخت کر دیتے ہیں۔"(۳) ذہن انسانی کی نفسیاتی پیچیدگیاں بڑی گوناگوں ہیں۔ کبھی کسی فرد کے داخلی حالات اور کبھی خارجی عوامل اسے ایسی پامال راہوں کا مسافر بھی بنا دیتے ہیں جن راستوں کی مخالفت میں اس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوتا ہے۔ اس تبدیلی کا تعلق جب کسی مجبوری سے ہوتا ہے تو کسی حد تک قابل قبول ہوتی ہے لیکن جب نظریات کی یہی تبدیلی ذاتی مفادات کی خاطر رونما ہوتی ہے جو قابل نفرت قرار پاتی ہے، نظریات سے بے وفائی کی مرتکب ٹھہرائی جاتی ہے۔ مختصر لفظوں میں آخر شب کے ہم سفر" بھی ایک ایسا ناول ہے جس میں آدرش سے بے وفائی کا المیہ ظاہر ہوتا ہے۔(۴) آدرشوں سے اس بے وفائی کی داستان میں مزاح کی نسبت طنز بہت زیادہ ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں بڑے ہلکے پھلکے انداز میں کچھ ایسے مکالمے، واقعات اور اشارے مل جاتے ہیں جنھیں پڑھتے ہوئے قاری کو کسی قدر شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کسی قدر اس ناول میں بھی ملتی ہے۔ تقسیم سے قبل ایک دوست کے گھر میں مختلف مذہبی پس منظر والی انقلابی لڑکیاں مل بیٹھی ہیں اور ایک دوسری کے مستقبل کے بارے میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ایک مسلمان نسوانی کردار جس کے بارے میں یہ مندرجہ ذیل جملہ قاری کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے:

> "تیرا تو--اس کا جہاں آراء کا تو کسی دڑھیل مولوی سے بیاہ ہو گا- جناب مولوی بے نوجیر الدین احمد صاحب!" موٹی مسخری رومولا نے منہ پھاڑ کر ہاہا کرتے ہوئے کہا اور چنے پھانکتی رہی۔"(۵)

اسی طرح کچھ آگے چل کر جب ایک انگریز کردار کا بیٹا جو سوامی بن گیا ہے اور ایک نسوانی کردار 'مسز سین' کے ساتھ ایک ہی جہاز میں سفر کر رہا ہے۔ مسز سین گھڑی دیکھتی ہیں اور استعجاب کے ساتھ کہتی ہیں کہ سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے، ہم کتنی جلدی ایتھنز پہنچ جائیں گے یہ سب سائنس کی ترقی کا کمال ہے۔ "تو سوامی جی بڑے فخر اور یقین سے اُسے بتاتے ہیں:

> "سائنس-؟ پرا چین کال میں ویمان اڑتے تھے اور مہابھارت کے زمانے میں ٹیلی وژن ایجاد ہو گیا تھا۔ انگریز ہندوئوں کی قدیم کتابیں چُرا کر لے گئے اور ان کی بنا پر ترقی کر لی۔ اب امریکن۔ روسی کہتے ہیں چاند پر پہنچ گئے۔ یہ جھوٹ ہے۔ چاند پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔" سوامی جی نے کہا۔"(۶)

ناول کا قاری سوامی جی کی ان باتوں سے بے ساختہ مسکرا دیتا ہے۔ موجودہ دور میں سائنس کی ترقی کا، چالیس اور پچاس کی دہائی سے کوئی موازنہ ہی نہیں ہے۔ آج کے اس سائنسی ترقی کے دور میں کروڑوں سال پرانے فوسلز پر بھی تحقیق ہو رہی ہے، کسی ہندو برہم چاری کا یہ تیقن کس قدر مضحکہ خیز لگتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مصنفہ نے جو بات آج سے چالیس سال پہلے لکھی ہے وہ موجودہ دور

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

کے ایسے ہندوؤں پر آج بھی صادق آتی ہے۔ اسی سال بھارت میں ہونے والی ایک بین الاقوامی انڈین سائنس کانگریس کا ۱۰۶ سالانہ اجلاس ہوا جو تین تاسات جنوری ۲۰۱۹ء جاری رہا۔ اس کا باقاعدہ افتتاح موجودہ وزیر اعظم نریندر مودی نے کیا۔ اس کانفرنس میں پڑھے جانے والے بعض مقالے عالمی سطح پر بھارت کی جگ ہنسائی کا باعث بنے۔ اسی کانفرنس میں آندھرا یونی ورسٹی کے وائس چانسلر نگیشور راؤ نے کہا کہ ہندو مقدس کتاب رامائن میں ایک بادشاہ کا ذکر ملتا ہے جن کے پاس ۲۴ قسموں کے ہوائی جہاز تھے اور وہ انھیں سری لنکا کے ہوائی اڈوں پر اُتارا کرتے تھے۔(۷) اسی طرح اس کانفرنس میں یہ بھی دعوی کیا گیا کہ ٹیسٹ ٹیوب بی بی، پلاسٹک سرجری اور میزائل ٹیکنالوجی قدیم ہندو ایجادیں ہیں۔(۸)

ناول کا مرکزی کردار ریحان اور ایک ہندو انقلابی لڑکی دیپالی سندر بن کے جنگل میں موجود ہیں۔ ریحان کو تنظیم کی طرف سے حکم ملتا ہے کہ وہ خود کو کچھ دیر کے لیے روپوش کر لے۔ وہ دیپالی کے ہاتھ کچھ ضروری کاغذات اور اشیا منگواتا ہے۔ زیر نظر مکالمہ ایک شگفتہ پیرائیہ اظہار کی بڑی خوب صورت نمائندگی کرتا ہے:

"دیپالی نے بیگ میں سے دو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ یہ آپ کے پاس کہاں سے آ گئے تھے۔ اس نے چونک کر نوٹوں پر نظر ڈالی۔ ہمیں اپنی کتاب کی رائلٹی ملی تھی۔ مگر تم کیسے آئیں یہاں تک؟ ہم بھی رئیس ہو گئے ہیں۔ ہمیں اپنے ریکارڈوں کی رائلٹی ملی تھی۔ افوہ۔ تو اس وقت گویا دو سرمایہ دار سُندر بن میں آ وٹنگ کر رہے ہیں۔ اس نے شگفتگی سے ایک کنکر پانی میں پھینکا۔"(۹)

انگریزوں کے آنے سے ہندوستان میں تہذیبی سطح پر اکھاڑ پچھاڑ ہوئی اس میں جہاں کچھ پرانی قدریں پامال ہوئیں وہاں کسی حوالے سے بہتری بھی ہوئی۔ خاص طور پر پڑھی لکھی خواتین میں اپنے حقوق کا شعور اجاگر ہوا۔ انھوں نے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکے جانے کے خلاف آواز اٹھائی۔ پتی ورتا یا پتی برتا کی ان حدود کو للکارا جن کی آڑ میں عورت کا استحصال روا رکھا جاتا تھا۔ اب اس ناول کے سارے اہم کردار نوجوان نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور جدید تعلیم سے بہرہ ور ہیں۔ ایسی ہی ایک نشست میں جب ایک مرد کردار دوسرے نسوانی کردار کو کسی کام کا حکم دیتا ہے تو مذکورہ بالا صورت احوال کا بخوبی اندازہ ہو رہا ہے:

"اچھا کہیں سے ماچس لاؤ۔ کس مزے سے حکم چلاتے ہیں میں کنیز ہوں ان کی زر خرید۔ چرنوں کی داسی۔ کتنے ہی کامریڈ بن جائیں اصلیت میں رہیں گے وہی نخالص ہندوستانی۔ لارڈ اینڈ ماسٹر --میں نہیں لاتی ماچس واچس۔"(۱۰)

صدیوں کی طویل ملوکیت و شہنشاہیت کے بعد جب اس خطے میں انگریز نے لولی لنگڑی جمہوریت متعارف کروائی تو شروع میں عوامی دل چسپی نہ ہونے کے برابر تھی پھر جیسے جیسے عوامی شعور بیدار ہوتا گیا، جمہور کے رویوں میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۶ء کے انتخابات اس فرق کی واضح مثال ہے۔ اس تبدیلی کی ایک بڑی وجہ ان انتخابات کا آزادی کے نظریے سے جُڑ جانا بھی تھا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد جب اس خطے کی سیاست کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہیں رہا تو وہ بڑی حد تک گروہی سیاست، مذہبی منافرت، اور ذاتی مفادات کی طرف پلٹ گئی۔ علمی و معاشی پس ماندگی، (جس سے عوام کی اکثریت کا تعلق تھا) نے اس طرز سیاست کو پروان چڑھانے میں بہت مدد کی۔ انگریزوں نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور ان منافرتوں کی آڑ میں اپنے اقتدار کو طوالت بخشی۔ قرۃ العین حیدر نے بڑے جامع لیکن طنزیہ انداز میں اس کی توجیہہ پیش کی ہے:

"جس دھرتی پر کھانے کو کم ملے گا وہاں فرقہ وارانہ کشمکش ناگزیر ہے کہ سب ایک دوسرے کے منہ سے روٹی چھین کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتے ہیں۔ یہ جنگل کا قانون ہے۔ برطانوی نظام ایک ایسی دکان ہے جس کے سامنے کھڑے ہوئے قطار اندر قطار مختلف ہندوستانی فرقے اپنے اپنے کشکول سنبھالے، جھولیاں پھیلائے ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھنا چاہ رہے ہیں اور سر پھٹول میں مصروف ہیں۔ اور یہ بھوکے 'فرسٹریٹڈ' انبار مل عوام آپس میں فساد کر کے ملک کی قسمت کا آج کل فیصلہ کروا رہے ہیں۔"(۱۱)

وقت کے ساتھ ساتھ ان ہندوستانی فرقوں کا رخ سیاست کی طرف مڑ گیا۔ اس مذہبی منافرت کو ہندوستان کی قومی سیاست کے اہم جزو کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ انڈین نیشنلزم اور معاشرتی و معاشی گروہ بندیاں بھی سامنے آئیں۔ ان حالات میں نام نہاد نمائندوں کی ایک بڑی تعداد اپنی سیاسی و نظریاتی وابستگیاں تبدیل کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مذکورہ ناول کے نصف آخر میں جب ناول کا مرکزی کردار اپنی نظریاتی اور سیاسی وابستگیاں تبدیل کرتا ہے تو مصنفہ کے قلم میں طنز کی کاٹ زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ جمہوری سیاسی رویوں میں تنوع اور جمود دو مختلف عوامل ہیں لیکن ان عوامل کو ذاتی مفادات، دولت اور عہدے کے حصول کے لیے استعمال کرنا بالکل دوسری سطح ہے۔ جس کی ہر دور میں حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں منفی سیاست پر بھی طنز ہے۔ جہاں پارٹیاں بدلنے والوں کو قبول کر لیا جاتا ہے۔(۱۲) ناول کا مرکزی کردار ریحان ایک کامریڈ ہے اور بنگال کی ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم سے براہ راست منسلک ہے۔ تقسیم کے بعد حالات تبدیل ہوتے ہیں تو وہ خود کو نئے سیاسی دھاروں میں اس طرح شامل کرتا ہے کہ اپنے تمام انقلابی نعرے پس پشت ڈال دیتا ہے۔ اس سے پہلے وہ ایک نام نہاد رومانی و انقلابی کردار ہے۔ اس کے دوہرے رویے سے پتہ چلتا ہے کہ تحریک سے بے وفائی یا غداری کے نتیجے میں انسان اپنی ذات میں سمٹ کر مادیت پسند بن کر اُبھرتا ہے۔(۱۳) ایسا کیوں ہوتا ہے؟ معراج رعنا اس کی وجہ بیان ہوئے لکھتی ہیں کہ ہر مقصدی تنظیم شروع میں اصولوں کی بنیاد پر اپنی بقا کی ضامن ثابت ہوتی ہے۔ لیکن جب اس پر ذاتی مفادات کا غلبہ طاری ہوتا ہے تو اصولوں کی زنجیریں کچے دھاگے کی طرح ٹوٹنے لگتی ہیں۔" (۱۴) اسی بنا پر ناول کے آخر میں جب دیپالی ان کے گھر جاتی ہے تو ریحان کی بھانجی ناصرہ (جو اپنے تئیں اس دور کی انقلابی اور سوشلسٹ ہے) کی اپنے ماموں کے بارے میں رائے کس قدر طنز سے بھرپور ہے:

"ماموں جان۔ کیا خوب چیز ہیں۔ مکمل آدرش وادی۔ مجسم انٹرنیشنل گڈ ول۔ آج پراگ میں ہیں۔ کل قاہرہ۔ پرسوں نیویارک۔ آج اس پولیٹکل پارٹی میں کل اس میں۔ جہاں منسٹر بننے کے مواقع زیادہ نظر آئیں۔ ادھر کو لڑھک گئے۔ ماسکو اور واشنگٹن دونوں کے خیر خواہ۔ مکمل جانب داری اسے کہتے ہیں۔"(۱۵)

وقت کے تناظر میں تہذیبی زوال کی پیش کش، قرۃ العین حیدر کا اہم موضوع ہے۔ اگر اسے اُس کا مرکزی موضوع قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ وقت بے وقت، کسی کردار کی زبانی، تلازمہ خیال کی صورت میں یا پھر شعور کی رو کے تحت وہ اکثر و بیشتر اس کا اظہار کرتی ہیں۔ ناول "آگ کا دریا" میں یہ تہذیبی اتھل پتھل زیادہ نمایاں ہے لیکن یہ ناول بھی اس کی بازگشت سے یکسر خالی نہیں

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہے۔زمانہ ماضی کو حال تک آتے آتے جو سنگ میل عبور کرنے پڑے یا تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں ان سب پر مصنفہ کی بڑی گہری نظر ہوتی ہے۔ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک طرح کا طنز نمایاں ہو جاتا ہے لیکن یہ طنز انسان دوستی کا طنز ہے جو کسی مذہبی، سیاسی یا جغرافیائی بنیاد پر قائم نہیں کیا گیا۔یہی وجہ ہے کہ جب وہ ایسے خیالات کا اظہار کرتی ہیں تو بلا تفریق لتاڑ کر رکھ دیتی ہیں۔کچھ اقتباسات دیکھیے:

"اب دیپالی نے کھڑکی کی جھلملی چڑھا کر باہر جھانکا۔اسی راستے پر آگے جا کر ارجمند منزل تھی جس میں جہاں آرا رہتی تھی۔جہاں آرا بیگم 'جو اس دھندلی داستان کے آخری صفحات پر زندہ تھی جس کے مصنفوں نے جہانگیر نگر (ڈھاکہ کا پرانا مغل نام) آباد کیا تھا۔اسی راستے پر 'اونچے اونچے مغرور درختوں کے پیچھے ڈی ایم کا بنگلہ تھا۔ اس بنگلے میں رہنے والا ولیم کینٹ ویل اس داستان کا اہم کردار تھا جس کے مصنفوں سے جہانگیر نگر اُجاڑا تھا۔اس راستے کے اختتام پر "ووڈ لینڈز" تھا۔نئی داستان کے مصنفوں نے جہانگیر نگر کے فاتحین کے تعاون سے اپنے لیے کیسے کیسے "ووڈ لینڈز" تعمیر کیے تھے۔"(۱۶)

"ایک آدمی کے قتل کی سزا پھانسی ہے مگر ہزاروں لاکھوں قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ان کے قاتل قومی ہیرو اور جانباز سپاہی اور مادر وطن کے سپوت کہلاتے ہیں۔ اور پھر ایک اجتماعی قتل کو ناجائز قرار دینے کے لیے ایک اور اجتماعی قتل کیا جاتا ہے۔"(۱۷)

"تو کیا آپ کے ایلزبتھن انگلستان میں بات بہ بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دیے جاتے تھے؟ جسے دیکھو ٹاور آف لندن میں پڑا چیخ رہا ہے اور دوسرے روز کھٹ سے سر غائب۔وہاں عام آدمی کے لیے کوئی انصاف تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑ کی چوری کی سزا موت تھی۔اب یہ "لا اینڈ آرڈر" کا کس منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں۔یہ انگریز کے بچے کمینے-ہماری دولت لوٹ کر خود کو مہذب بنایا۔"(۱۸)

اس کے ساتھ ہی وہ ہندوستانی شاعری، طرز سیاست اور اخلاقی قدروں پر چوٹ کرتے ہوئے انگریزی نقطۂ نظر بھی بڑی سہولت کے ساتھ بیان کر جاتی ہیں:

"ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ رابندر ناتھ 'اسی طرح آپس کے کشت وخون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔آخر دیکھو افغانستان وغیرہ کی کیا حالت ہے۔ٹیگور نے شیلی اور کیٹس نہ پڑھا ہوتا تو ایسی شاعری نہ کرتا۔"(۱۹)

"انڈیا ہے کہاں؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں۔انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔ایک بار اکبر نے (کوشش کی مگر فیل ہو گیا) اور واقعی اسے ہم نے متحد کیا ہے۔" (۲۰)

پنجاب کے وسیع میدانوں کے بعد بنگال ایک زرخیز خطہ ہے، چاول، پٹ سن اور دریائی مچھلی کی پیداوار میں عالمی شہرت کا حامل ہے۔قبل ازیں قحط کی کوئی مثال اس خطے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔لیکن ایک "منصف المزاج بالادست طبقے" کے فیصلوں کی بنا پر انیسویں اور بیسویں صدیوں میں اس خطے کو بارہا قحط سے دوچار ہونا پڑا۔آزادی سے ذرا قبل اس خطے میں آنے والا قحط نسل انسانی کو پیش آنے والے عالمی سانحات میں سے ایک ہے۔ایسا سانحہ جس میں مصنفہ ہی کے بقول چونتیس لاکھ انسان فاقے سے مر گئے۔(۲۱) شاعری اور افسانوی ادب میں اس بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔فضل کریم فضلی کے ناول "خونِ جگر ہونے تک" کا موضوع بھی یہی قحط ہے۔اس ناول کا لوکیل بھی چوں کہ بنگال ہے اس لیے یہاں کے معاشی استحصال کا ذکر قرۃ العین حیدر کے ہاں بھی ملتا ہے۔انھوں نے ایک جملے میں اس ساری کسک کو سمیٹ دیا ہے۔وہ لکھتی ہیں کہ چاول۔چاول۔چاول۔"سنہرا بنگال" سال میں تین بار چاول اگاتا ہے اور بھوکا رہتا ہے۔"(۲۲) مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کے بہت سے عوامل میں ایک 'سنہرے ریشے' یعنی پٹ سن کی دولت سے مالا مال ملک کے وسائل کی لوٹ کھسوٹ بھی تھا۔اس معاشی استحصال کو قرۃ العین حیدر نے بھی شدت سے محسوس کیا ہے وہ لکھتی ہیں:

"بنگال کے کسان نے اس ریشے کی خاطر سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔۔۔۔اب یہ "طلائی ریشہ" کارگو کے مہیب فولادی جہازوں پر لد کر طویل دریاؤں پر سے گزرتا جوٹ اسٹیشنوں پر پہنچے گا۔۔۔کلکتے کے تاریک کارخانے اور اسکاٹ لینڈ کے جگمگاتے بینک بنگال کے اس سنہرے دھن کی منزل ہیں۔"(۲۳)

قرۃ العین حیدر کے اُسلوب کی تمام خصوصیات کا حامل یہ ناول اپنے ماجرے میں ایک زمانی و مکانی وحدت بھی رکھتا ہے۔اس ناول کے بارے میں رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر سید جاوید اختر نے لکھا ہے کہ "قوت بیان کی تو قرۃ العین حیدر میں کبھی کمی نہیں رہی۔افسانہ ہو یا ناول ان کا قلم عجیب انداز میں موتی پرونے میں مشاق رہتا ہے لیکن جب ان کے قلم کی سماجی، مذہبی اور سیاسی طرف داریوں کی حدود سے نکل کر لکھنا شروع کیا تو "آخر شب کے ہم سفر" کی تخلیق ممکن ہوئی۔(۲۴) یہی وجہ ہے کہ "آگ کا دریا" کے برعکس "آخر شب کے ہم سفر" بہت ساری جامعات کے نصاب کا حصہ ہے۔ اس ناول کے موضوع، اس کی کہانی، اس کا بیانیہ، اُسلوب، ہیئت اور کردار نگاری وغیرہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔اس لیے راقم نے مذکورہ بالا پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف اپنے موضوع کے حوالے سے ہی ناول کا مطالعہ کیا ہے اور بین المتن بکھرے ہوئے طنزیہ و مزاحیہ پیرائے کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔

**حوالہ جات**

۱۔محمد عارف، پروفیسر، ڈاکٹر، اُردو ناول اور آزادی کے تصورات، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۰۶ء، ص ۵۸۰
۲۔ایضاً، ص ۶۰۵
۳۔ممتاز احمد، خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۸ء، ص ۲۰۹
۴۔ایضاً، ص ۲۱۱
۵۔قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص ۱۴
۶۔ایضاً، ص ۳۲۳

Vol.5 No. 2 2022
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

7. https:/bbc.com/urdu/regional-46781181

8. https://www.urduvoa.com/a/india-science-co nference -/4734011.html

(بھارت کی اہم علمی اور سیاسی شخصیات کی جانب سے جدید دور کی ترقی کا ماخذ قدیم ہندو اساطیر کو قرار دیا جانا کوئی نئی بات نہیں ہے تاہم انڈین سائنٹیفک کانگریس ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری پرمندو پی ماتھر نے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ ان کے نظریات سے اتفاق نہیں کرتے اور ان دعووں سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں)

۹۔ ایضاً، ص ۹۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۱۲۔ ممتاز احمد، خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، ص ۲۱۱

۱۳۔ صفدر نعیم، ڈاکٹر، آخر شب کے ہم سفر: تہذیبی تناظر میں، مشمولہ نمود حرف، لاہور، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء، ص ۱۰

14. www.aikrozan.com.pk/quartul-ain-haider-novel/

۱۵۔ قرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہم سفر، ص ۳۰۳

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۱۔ ۳۴۰

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۹

۲۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۲۳۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۲۴۔ ڈاکٹر سید جاوید اختر، اُردو ادب کی خواتین ناول نگار، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳۲